فکر و نظر............ اسلام آباد جلد: ۴۵ شمارہ: ۳

فارسی سے اُردو میں ترجمے کی روایت
آغاز سے ۱۸۵۷ء تک

سفیر اختر☆

فارسی اور انگریزی دو ایسی غیر ملکی زبانیں ہیں جنھیں برصغیر پاکستان و ہند میں غیرمعمولی عروج و ترقی حاصل ہوئی، اور برصغیر کے اہلِ قلم نے ابلاغِ فکر اور ترسیلِ اطلاعات کے لیے ان سے پورے طور پر کام لیا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ زبانیں عوام کی سطح پر کبھی گلی بازار کی زبانیں نہ بن سکیں اور آبادی کا بہت بڑا حصہ ان سے نابلد ہی رہا۔ آبادی کے اسی حصے کے استفادے کے لیے اِن زبانوں سے مقامی زبانوں میں ترجمے کا عمل جاری رہا۔

زیرِنظر تحریر میں ۱۸۵۷ء تک فارسی سے برصغیر کی ایک اہم زبان اُردو میں ہونے والے تراجم کا ذکر مقصود ہے، تاہم بطور مقدمہ اِس خطے میں فارسی کے نفوذ و اثر اور اُردو کی پیش رفت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

برصغیر میں فارسی زبان کا نفوذ واثر

فارسی، اصلاً فارس کے رہنے والوں کی زبان تھی جو آج جنوب مغربی ایران کا ایک صوبہ ہے، تاہم فارس کی زبان کا دائرہ اس خطے کے حکمرانوں کے اقتدار کے ساتھ بڑھتا چلا گیا، اور خود زبان بھی ارتقائی مدارج طے کرتی رہی۔

فارسی زبان و ادب کے مؤرخین کی ایک رائے یہ ہے کہ فارسی نے حالیہ شکل نویں صدی عیسوی میں اختیار کی، تاہم اس کی جڑیں ماضی میں بہت گہری ہیں۔ اوستائی اور پہلوی، فارسی کی ابتدائی شکلیں تھیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو فارسی اور برصغیر پاکستان و ہند کے روابط کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ بعض اہلِ قلم کے نزدیک ہخامنشی خاندان (۵۵۰ - ۳۲۳ ق م) کے کوروش اعظم کی سلطنت میں برصغیر کے شمال مغربی علاقے کا کچھ حصہ شامل تھا، اور اگر اس بیان کے ناقدین کی مین میخ کو درست بھی مان لیا جائے تو داریوش کے زمانے کے سنگی کتبوں کی تحریریں گندھارا کو ہخامنشی سلطنت کا حصہ

☆ مکان نمبر۲، گلی نمبر۶، نیو سٹی، پشاور روڈ-واہ کینٹ

DMHL

ماننے پر مجبور کر دیتی ہیں، اور الناس علی دین ملوکھم کے ہمہ گیر اور عالم گیر رواج اور چلن کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہخامنشی سلطنت میں شامل گندھارا کی آبادیوں میں لازماً کچھ ایسے لوگ رہے ہوں گے جو حکمرانوں کی زبان ـــــ فارسی باستان ـــــ جانتے تھے جو ہخامنشی منتظمینِ سلطنت اور عامۃ الناس کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔

ہخامنشیوں کے بعد آنے والے پارتھی، ساکا، کشان اور ساسانی حکمرانوں نے اس تعلق کو برقرار رکھا ہو گا، تاہم جب ساسانیوں کی طاقت و حشمت کا سورج بڑھتے ہوئے مسلم اقتدار کے سامنے گہنا گیا، اور فارس کے باسی حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے، تو فارسی بولنے والوں کے درمیان بسنے والے بعض عرب نژاد بھی فارسی شناس بن گئے۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی میں جب رودکی (م ۹۴۰ء) خراسان میں نغمہ سرا تھا تو خضدار (بلوچستان) میں ایک عرب امیر کی صاحبزادی رابعہ بنت کعب قزداری بھی اظہارِ جذبات کے لیے یہی زبان استعمال کر رہی تھی (۱)۔

دسویں صدی میں برصغیر کے شمال مغربی علاقے اور کابل سمیت موجودہ افغانستان کے بعض حصوں پر، جو کبھی ایرانی سلطنت اور فارسی زبان کے زیرِ اثر تھے، ہندو شاہیہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہندو شاہیہ کے حکمران جے پال کی معاصر حاکمِ غزنہ سلطان سبکتگین (م ۹۹۷ء) کے ساتھ ٹھن گئی، اور جے پال کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد سبکتگین کے فرزند و جانشین سلطان محمود غزنوی (م ۱۰۳۰ء) کے لیے برصغیر جولاں گاہ بن گیا۔ غزنوی فاتحین نے شمال مغربی برصغیر کو غزنی کے ساتھ ملحق کرلیا، اور اپنی طرف سے یہاں ایک نائب السلطنت کا تقرر کر دیا۔ لاہور اس نائب السلطنت کا انتظامی مرکز تھا، سرکار دربار سے وابستہ افراد ـــــ وزیروں، مشیروں، شاعروں، عالموں اور اہل عیش و طرب ـــــ کو غزنی و خراسان سے آ آ کر یہاں جمع ہونا ہی تھا، تاہم ان کے ساتھ فارسی بولنے والے متعدد خاندان بہتر معاشی حالات کی امید میں نقل مکانی کر کے یہاں آ گئے۔ ''تاریخ سلاطین اہلِ غزنین'' کے مؤلف نے اس دور کے ایک صاحبِ علم وزیر ابونصر فارسی کی علمی سرگرمیوں کے ذکر میں ضمناً لکھا ہے کہ ''جوق در جوق تشنگانِ علوم از سائر بلادہند و ولایت ہای کاشغر و ماوراء النہر و عراق و بخارا و سمرقند و خراسان و غزنی وغیرہ ذالک ازاں خیرات منتفع می شدند، چندانکہ یک آبادانی نو در حدود لاہور پدید آمد''(۲)۔

غزنوی دورِ اقتدار (تا ۱۱۸۶ء) میں شمال مغربی برصغیر اور پنجاب میں مسلم ادب و دانش کا جو ذخیرہ وجود میں آیا، اس کا بڑا حصہ فارسی زبان ہی میں ہے۔ بعدازاں شہاب الدین محمد غوری کی عسکری مہمات اور اس کے جانشینوں کی جرأت آزمائی کے نتیجے میں سلطنتِ دہلی قائم ہوئی، اور تیرہویں صدی

کے آغاز سے انیسویں صدی تک فارسی مسلم برصغیر کی ثقافتی زبان بنی رہی۔ اسی زمانے میں مقامی آبادی، اور شمال مغرب سے آنے والے فارسی دانوں، ترکوں اور افغانوں کے باہمی میل ملاپ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو آج اردو کے نام سے معروف ہے۔

جناب جمیل جالبی، محمد عوفی (م بعد از ۱۲۳۳ء) کے تذکرہ ''لباب الالباب'' اور امیر خسرو (م۱۳۲۴ء) کے دیوان ''غرّۃالکمال'' کے دیباچے کے اس بیان پر، کہ مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶-۱۱۲۱ء) کا ایک ''ہندوی'' دیوان بھی تھا، ''ہندوی'' اور ''اُردو'' کو مترادف قرار دیتے ہوئے بارھویں صدی کے آغاز میں اردو زبان میں ایک شاعر کے پورے دیوان، یا دوسرے لفظوں میں ایک کتاب کی موجودگی کے قائل نظر آتے ہیں(۳)۔ مسعود سعد سلمان کے ''ہندوی'' دیوان کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں، اور نہ اس کے ''ہندوی'' اشعار اتنی تعداد میں ملتے ہیں کہ بارھویں صدی میں اردو کو ایک ثروت مند زبان مان لیا جائے، مزید برآں مسعود سعد سلمان کے کم و بیش دو صدی بعد کے امیر خسرو کے ہاں جن ''ہندوی'' کلمات و محاورات یا کہہ مکرنیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، ان سے بھی واضح ہے کہ اردو ابھی ارتقاء کی ابتدائی منزل میں تھی۔ سلاطینِ دہلی کے بعد مغلوں کا اقتدار جوں جوں آگے بڑھتا ہے، اردو زبان نکھرتی چلی جاتی ہے، اور بعض نقادوں نے زبان کے نکھار اور قبول عام کی وجہ سے اُردو کو مغلوں کی دین ہی قرار دیا ہے(۴)۔

معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں، اردو کے بال و پر نکال لینے کے باوجود، فارسی کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا، حتیٰ کہ مغلوں کے عہدِ زوال (۱۷۰۷ - ۱۸۵۷ء) میں مرکز گریز اور ہندو غلبے کے علم بردار مرہٹوں نے بھی مغلوں کی طرح فارسی کی دفتری حیثیت قائم رکھی۔ ان کے ہاں اکثر عہدوں کے نام تک فارسی تھے، اورسرکاری خط و کتابت، نیز کاروبارِ سلطنت چلانے کے لیے کائستھ ہندو ملازم رکھے جاتے تھے جو فارسی انشاء و زبان میں مہارت رکھتے تھے۔ سکھوں کا راج ایک خالص مسلم خطے میں قائم ہوا تھا، جہاں اسلامی علوم کے مرکز تھے، اس لیے انہیں بھی فارسی سے مفر نہ تھا۔ ان کا جملہ کاروبارِ سلطنت فارسی میں ہوتا تھا، اور فقیر عزیزالدین (وزیر مہاراجا رنجیت سنگھ) نہ صرف فارسی زبان کا ماہر تھا، بلکہ اپنے وقت کا ایک نمایاں شاعر و ادیب بھی تھا،اور جب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارے سے حکمران قوت بن گئی تو اس نے بھی ابتداء میں فارسی ہی کو دفتری زبان کے طور پر قبول کیا، تمام حسابات اور ملکی معاملات اسی زبان میں انجام دیے جاتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور فارسی زبان کی سرپرستی

کمپنی کو آغاز میں حکومت و سلطنت سے چنداں دلچسپی نہ تھی، بلکہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانا اس کا اول و آخر مقصد تھا۔ کمپنی کے کارپرداز ترجمانوں کی وساطت سے مقامی آبادی سے رابطہ رکھتے تھے۔ کمپنی کے ریکارڈ میں ایسے متعدد ترجمانوں، منشیوں اور وکیلوں کا ذکر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب برطانیہ میں برصغیر کو ''ارضِ عجائب'' سمجھا جاتا تھا، اور کمپنی کے کارپردازوں کو مستشرق اہل علم کے زیرِ اثر برصغیر کی علمی زبانوں ـــــ سنسکرت، عربی، فارسی ـــــ اور علوم و فنون سے دلچسپی تھی۔ وارن ہیسٹنگز جو ۱۷۷۴ء میں فورٹ ولیم کلکتہ کا گورنر بنا، مشرقی علوم والسنہ کا زبردست حامی تھا۔ وہ خود فارسی شناس تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۷۵۵ء میں شمالی علاقوں میں تجارتی امکانات کا جائزہ لینے کے لیے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس کے سربراہ کے طور پر وہ بہ نفسِ نفیس شمالی علاقوں کے نوابوں اور راجاؤں کے درباروں میں گیا جہاں فارسی میں کاروبار انجام دیا جاتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کی فارسی زبان سے ذاتی دلچسپی، اور اس کی نگاہ میں فارسی کی اہمیت ہی تھی کہ اس نے کلکتے میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جس میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو فارسی سکھائی جاتی تھی، گو یہ تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو سکا، تاہم سرکاری و عدالتی سطح پر فارسی کا چلن قائم رہا۔ عدالتوں میں مسلم آبادی کے مقدمات نمٹانے، نیز کمپنی کی ملازمتوں کے لیے افراد کی تیاری کی خاطر مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا گیا (۱۷۸۱ء)، جس میں فارسی اور عربی کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا(۵)۔

اُردو کا ابتدائی سرمایۂ ادب

اٹھارہویں صدی کے آخر تک شمالی ہند میں جب فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، اس سے بہت پہلے پندرہویں صدی میں جنوبی ہند میں اردو میں باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع ہو چکی تھی(۶)۔

سلطان احمد شاہ اوّل بہمنی کے دورِ حکومت (۱۴۲۱ - ۱۴۳۴ء) میں فخر دین نظامی نے ''مثنوی کدم راوٗ پدم راوٗ'' نظم کی تھی۔ چشتی سلسلے کے بزرگ میراں جی شمس العشاق (م ۱۴۹۶ء) کی منظومات ـــــ ''خوش نامہ''، ''خوش نغز''، ''شہادت التحقیق'' اور ''مغز مرغوب'' ـــــ سینکڑوں اشعار پر مشتمل ہیں۔ شاہ اشرف بیابانی (م ۱۵۲۸ء) کی منظوم تصانیف ـــــ ''لازم المبتدی''، ''واحد باری'' اور نوسرہار'' ـــــ موضوعی تنوّع کی حامل ہیں۔ ''لازم المبتدی'' میں طہارت و وضو اور نماز روزے کے مسائل کا بیان ہے۔ ''واحد باری'' (''خالق باری'' کے طرز پر) عربی و فارسی اور اردو کی لغت ہے اور ''نوسرہار'' میں

واقعاتِ کربلا کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ''نوسرہار'' (تالیف و نظم: ۱۵۰۳ء) نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مثنوی میں نو باب ہیں، اور ہر باب شاعر کی نظر میں ایک ان مول ہار کی حیثیت رکھتا ہے۔

عوامی سطح پر اردو کے فروغ و ترویج کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر یہ بہمنی سلاطینِ دکن احمد شاہ اوّل اور اس کے جانشینوں کی اردو دوستی کا نتیجہ تھا کہ بہمنی دفاتر اردو میں کام کرنے لگے تھے۔ بہمنیوں کے زوال پر جب عادل شاہی خانوادۂ حکومت بیجاپور میں برسرِاقتدار آیا تو ابتداء میں اردو اور فارسی میں سے کسی ایک کو سرکاری زبان کے طور پر اپنانے میں اختلاف رہا، کبھی اردو اور کبھی فارسی میدان جیتتی رہی، تاہم ابراہیم عادل شاہ ثانی مؤلف ''کتابِ نورس'' جب تخت نشین ہوا تو اردو کے قدم جم گئے (۱۵۷۹ء)۔ اردو تصنیف و تالیف قدم بہ قدم آگے بڑھتی رہی۔ میراں جی شمس العشاق کے بیٹے شاہ برہان الدین جانم (م۱۵۸۲ء) نے نظم و نثر میں کتابیں لکھیں۔ ''رسالہ وجودیہ'' اور ''کلمۃ الحقائق'' تصوف کے موضوع پر بالترتیب باپ اور بیٹے کی نثری کاوشیں ہیں۔ شیخ احمد گجراتی نے ''مثنوی یوسف زلیخا'' (تالیف مابین ۱۵۸۰-۱۵۸۸ء) اور مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' لکھیں۔ شیخ احمد گجراتی کی ''مثنوی یوسف زلیخا'' نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بعد دوسری معلوم قابلِ ذکر مثنوی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ''کتاب نورس'' (تالیف: ۱۵۹۷ء) جس میں سترہ راگوں کے تحت ۵۹ گیت اور سترہ دوہڑے یک جا کیے گئے ہیں، کے علاوہ جو تصانیف سامنے آئیں، ان میں عبدل کی ''مثنوی ابراہیم نامہ'' (تالیف: ۱۶۰۳ء) بہت نمایاں ہے۔

میراں جی شمس العشاق اور ان کے صاحبزادے شیخ برہان الدین جانم سے منسلک سلسلۂ تصوف کے ادیبوں اور شاعروں ـــــ شیخ غلام محمد داول (م ۱۶۵۷ء)، شیخ محمود خوش دہاں اور شاہ امین الدین اعلیٰ (م ۱۶۷۵ء، فرزند شیخ برہان الدین جانم) نے سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری رکھا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں ملا اسداللہ وجہی (م ۱۶۵۹ء) نے مثنوی ''قطب مشتری'' تالیف کی (۱۶۰۹ء)۔ وجہی کی نثری تصنیف ''سب رس'' (تالیف: ۱۶۳۵ء) سے اردو ادب کے قاری بخوبی واقف ہیں۔ ایک اور تصنیف ''تاج الحقائق'' بھی وجہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے، مگر محتاط اہل علم کے نزدیک یہ انتساب درست نہیں(۷)۔ غواصی کی مثنویاں ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' (۱۶۲۵ء) اور ''طوطی نامہ'' (۱۶۳۹ء)، مقیمی کی ''چندربدن و مہیار''، محمد بن احمد عاجز کی ''یوسف زلیخا'' (۱۶۳۴ء) اور ''لیلیٰ مجنوں'' (۱۶۳۶ء)، ملک خوشنود کی ''جنت سنگھار'' (۱۶۴۰ء)، صنعتی کا ''قصۂ بے نظیر'' (۱۶۴۰ء)، کمال خان رستمی کا ''خاورنامہ'' (۱۶۴۰ء)، ابن نشاطی کی ''پھول بن'' (۱۶۵۵ء)، نصرتی (م ۱۶۷۴ء) کا ''علی نامہ''

اور ''فتح نامۂ بہلول خان''، اور سید میراں میاں خان ہاشمی بیجاپوری (م ۱۶۹۷ء) کی ''یوسف زلیخا'' چند اہم مثنویاں ہیں۔

جنوبی ہند میں اردو کی اس ترویج اور ترقی کے ساتھ شمالی ہند میں گو اتنی تصنیفات دستیاب نہیں ہیں، تاہم اردو مدرسوں اور مکتبوں میں ذریعۂ تعلیم بن چکی تھی، اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مدارس میں فارسی ادبیات نصاب کا جزو غالب تھیں۔ میر عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' (تالیف عہد اورنگ زیب عالمگیر) اردو الفاظ کی لغت ہے جو طلبہ کی درسی ضرورتوں کے تحت لکھی گئی تھی۔ بعدازاں سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۷۵۶ء) کی ''نوادر الالفاظ'' اسی سلسلے کی اگلی کڑی کے طور پر مرتب کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عامۃالناس کی تعلیم و تربیت کے لیے مذہبی تصانیف بھی اردو میں لکھی جانے لگی تھیں۔ شیخ عبداللہ انصاری کی ''فقہ ہندی'' (تالیف: ۱۶۶۳ء) اور شیخ محبوب عالم ساکن جھجر کی تصانیف —— ''محشرنامہ''، ''مسائل ہندی'' اور ''دردنامہ'' —— اسی قبیل کی تالیفات ہیں۔

ابتدائی اُردو نظم و نثر پر فارسی ادب کا اثر

سترہویں صدی میں اردو میں لکھی گئی نثری کتابوں اور منظوم تخلیقات کے موضوعات وہی ہیں جو برصغیر کی فضا میں فارسی زبان و ادب کے تھے۔ ان اصحابِ علم کی ساری تعلیم و تربیت فارسی مدارس کے ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے ابتدائی اردو نظم و نثر پر ہر لحاظ سے فارسی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، اور ان میں سے بعض کے مآخذ بھی فارسی کتابیں ہیں۔ ملاوجہی کی ''سب رس'' ہی کو لیجیے جو محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی تصنیف ''دستورعشاق'' (تالیف: ۱۴۳۶ء) کے نثری خلاصے ''قصۂ حسن و دل'' سے ماخوذ ہے۔ اوپر کی سطروں میں ''یوسف زلیخا'' نام کی ایک سے زیادہ مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور فارسی کے درسی ادب سے لگاؤ رکھنے والا ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مثنوی نگار اپنے مآخذ کی نشاندہی کریں یا نہ کریں، یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے قصے کا تانابانا مولانا نورالدین جامی (م۱۴۹۲ء) کی درسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ یہی حال اکثر دوسری مثنویوں کا ہے، تاہم بیس برس پہلے راقم الحروف کے مرتبّہ ایک طالب علمانہ جائزے ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبانہای پاکستانی''(۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی میں کم از کم دس بارہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن کے لکھنے والوں نے خود بتایا ہے کہ وہ فارسی متون کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں، اور جن لوگوں نے اس امر کا اظہار کیے بغیر ترجمہ کیا، ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ان اعداد و شمار کے بارے میں اہل علم باہم اختلاف کر سکتے ہیں، کیوں کہ ترجمہ، ترجمانی اور

اخذ و اکتساب کی سرحدیں باہم ملی ہوئی ہیں۔ ایک مترجم اپنی کاوش کو ترجمہ کہتا ہے، مگر تنقید نگار اسے ترجمے سے زیادہ ترجمانی خیال کرتے ہیں، اسی طرح کوئی شاعر اپنی کاوش کے طبع زاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، مگر نقاد اس کے مآخذ کی نشان دہی کرتے ہوئے اسے ترجمہ یا تلخیص قرار دے دیتے ہیں۔

سترہویں صدی میں فارسی سے اُردو تراجم

سترہویں صدی میں فارسی سے اردو میں جو تراجم ہوئے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں(۹):
''پھول بن'' (ابن نشاطی)، ''طوطی نامہ'' (غواصی)، ''جنت سنگار'' (ملک خوشنود)، ''خاور نامہ'' (رستمی)، ''سراج التواریخ، ترجمہ شاہنامہ فردوسی'' (نذر علی)،'' ترجمہ شمائل الاتقیاء'' (میراں یعقوب دکنی)، ''قصہ ابو شحمہ'' (ناشناس)، ''روضۃالشہداء'' (سیوا)، ''ترجمہ قصۂ فیروز شاہ'' (سید محمود)، ''نورنامہ'' (عنایت شاہ)، ''یوسف زلیخا'' (امین گودھروی)، ''قصۂ حسن و دل'' (شاہ حسین ذوقی) اور ''لیلیٰ مجنوں'' (محمد بن احمد عاجز)۔

''طوطی نامہ'' کی اصل سنسکرت زبان میں ہے۔ کسی نامعلوم صاحبِ ذوق نے اسے فارسی میں منتقل کیا تھا، مگر زبان نہایت مغلق اور مشکل تھی جسے ضیاء الدین نخشبی (م ۱۳۴۹ء) نے بعض اضافات کے ساتھ سلیس اور رواں فارسی نثر میں لکھا (تالیف ۱۳۲۹ء)۔ غواصی کا ''طوطی نامہ'' اسی کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

ہوئے حضرتِ نخشبی مج مدد
دیا میں اسے تو رواج اس سند
پراگندہ خاطر نہ کر اس بدل
کیا ترجع [کذا] مختصر اس بدل

ابن نشاطی کی ''پھول بن'' فارسی قصے ''بساتین'' کا ترجمہ ہے:

بساتین جو حکایت فارسی ہے
لطافت دیکھنے کی آرسی ہے
بچن کے باغ کی لے باغبانی
بساتین کی کئی سو ترجمانی

ملک خوشنود کی ''جنت سنگار'' امیر خسرو کی ''ہشت بہشت'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ کمال خان رستمی کا ''خاور نامہ'' ابن حسام (یا حسام الدین) قہستانی (م ۱۴۷۰ء) کے ''خاور نامہ'' کا ترجمہ ہے جو آخرالذکر

نے ''شاہنامۂ فردوسی'' کے تتبع میں حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے جنگی کارناموں کے ذکر میں نظم کیا تھا۔ اس کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں، بلکہ ''قصہ امیرحمزہ'' کی مانند کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ''ترجمہ شمائل الاتقیاء'' میراں یعقوب کی کاوش ہے جو خواجہ رکن الدین عمادکاشانی (خلیفہ خواجہ برہان الدین غریب) کی فارسی تالیف کا ترجمہ ہے۔ ''شاہنامہ فردوسی'' اور اس کے انتخاب کے پانچ چھ ترجمے ملتے ہیں، اور ان میں قدیم ترین ترجمہ نذر علی کا ہے۔ سیوا کا ترجمہ ''روضۃ الشہداء'' اسی نام کی کتاب (مؤلفہ کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی) کا اُردو روپ ہے۔ عاجز کی مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' اسی نام کی ہاتفی (م۱۵۲۱ء) کی مثنوی کا ترجمہ ہے۔

اٹھارہویں صدی

اٹھارہویں صدی میں اردو ادب کی ثروت میں جہاں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی، وہیں فارسی سے مذہب و اخلاق، تاریخ و تذکرہ اور داستانی ادب کے بعض متون کے ترجمے ہوئے۔ مذہبی موضوعات پر ''سراج المومنین'' (حسین دکنی)، ''معرفت السلوک'' (شیخ محمود چشتی)، ''دعائے سریانی''، ''نام حق'' (شرف الدین بخاری)، ''ریاض العارفین'' (ناشناس)، ''روضۃالشہداء'' (حسین بن علی واعظ کاشفی)، ''قصۂ شہادت حسینؑ'' (ناشناس)، ''قصص الانبیاء'' (ناشناس) اور ''مناقب غوثیہ'' (شیخ محمد صادق شہابی) کے متون اردو نظم و نثر میں منتقل ہوئے۔ ''روضۃالشہداء'' کو دکن کی مخصوص مذہبی فضا میں بالخصوص قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے منظوم ترجمے ولی ویلوری اور سید میرولی خان مونس نے کیے۔ آخرالذکر نے اپنے ترجمے کو ''ریاض الطاہرین'' یا ''حادثاتِ کربلا'' کا نام دیا۔ نثری ترجمہ ''وسیلۃ النجاۃ'' کے نام سے حسن بیگ نے کیا،اور شمالی ہند میں کاشفی کی ''روضۃالشہداء'' نے فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' کی شکل اختیار کی۔

فارسی ادب داستانوں کے حوالے سے بہت ثروت مند ہے، اور داستان گوئی معاشرتی تہذیب و تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اُردو مترجمین نے ''انوارِ سہیلی'' (کاشفی)، ''پدماوت'' (ملا عبدالشکور بزمی)، ''پدماوت'' (عاقل خان رازی)، ''قصۂ چہار درویش'' (حکیم محمد علی معصوم)، ''مثنوی خسرو و شیریں'' (نظامی گنجوی)، ''مثنوی لیلیٰ و مجنوں'' (نظامی گنجوی)، ''سنگھاسن بتیسی ''(چترُبھج داس کائستھ)، ''قصہ رضوان شاہ و روح افزا'' (ناشناس)، ''قصہ گل باصنوبر'' (ناشناس)، ''قصہ کامروپ و کام لتا'' (سید محمد مراد لائق)، ''قصہ لعل و گوہر'' (ناشناس)، ''مفرح القلوب'' (تاج الدین مفتی)، ''یوسف و زلیخا'' (نورالدین عبدالرحمٰن جامی) اور دوسری فارسی عشقیہ اور اخلاقی داستانیں اردو میں منتقل کیں۔

''مثنوی مولانا روم'' کے بیس کامل اور جزوی ترجموں میں سے ایک منظوم ترجمہ ''پیراہن یوسفی'' اٹھارہویں صدی میں مکمل ہواتھا۔ خواجو کرمانی کی مثنوی ''مطلع الانوار'' کا ترجمہ ولی ویلوری نے نظم کیا، اور خواجہ فریدالدین عطار کی ''منطق الطیر'' اور عطار سے منسوب ''مثنوی گل و ہرمز'' کو وجیہ الدین وجدی (م بعد از ۱۷۴۲ء) نے بالترتیب ''پنچھی باچھا'' اور''مثنوی تحفۂ عاشقاں'' کے نام سے نظم کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے اُردو کی سرپرستی

یہ اور دوسرے تراجم اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا نتیجہ تھے۔ یہی دور تھا جب مشرقی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی ملک گیری کے راستے پر پڑ گئی تھی۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں کو تو زیادہ سے زیادہ تجارتی مفادات حاصل کرنے سے غرض تھی، مگر برصغیر میں کام کرنے والے اس کے کارکنوں کو ملک گیری میں لوٹ مار کے زیادہ مواقع نظر آتے تھے، تجربے نے ان پر واضح کردیا تھا کہ ان کی سیاسی سرگرمیاں وقت کے ساتھ بڑھتی جائیں گی، اور اس مقصد کے لیے مقامی آبادی کی نفسیات، اس کی معاشرت اور تاریخ و تہذیب کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس پس منظر میں انہوں نے اپنے کارکنوں کو اردو زبان سکھانے کا اہتمام کیا۔

فارسی کے بجائے اردو کو اہمیت دینے کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ میں زبانوں کا معاملہ اسی طرح طے کیا گیا تھا۔ مذہبی قیادت نے مختلف زبانیں بولنے والوں پر لاطینی زبان مسلّط کر رکھی تھی۔ بائبل لاطینی میں دستیاب تھی، یہی کلیسیا میں وعظ و نصیحت کی زبان تھی، اور عامۃ الناس بائبل سے براہ راست استفادہ کرنے سے عاری تھے، چنانچہ کلیسیا کی اس پالیسی کو بدلنے کے لیے تحریکیں اٹھیں، مصلحین نے اپنی اپنی زبانوں میں بائبل کو پڑھنا پڑھانا شروع کیا، اس کے ترجمے ہوئے، اوریوں یورپ میں اصلاحِ فکر کی داغ بیل پڑی تھی۔ اشرافیہ کے بالمقابل عامۃالناس کی زبان کو اہمیت دینے کا یہ رجحان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان اہلِ دماغ کے پیش نظر تھا، جو ماضی کے مستشرق اہلِ علم کے زیرِ اثر نہ تھے، اور اپنی تہذیب و دانش پر اس حد تک فخر کرتے تھے کہ دنیا کو تہذیب سکھانے کے داعی تھے۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے کمپنی پر جب یہ واضح کیا کہ ''کمپنی کے انگریز سول سرونٹس کو محض ایک تجارتی ادارے کا ایجنٹ نہیں سمجھا جا سکتا، وہ اب دراصل ایک طاقتور شہنشاہ کے وزیر اور افسر ہیں''(۱۰)، تو کمپنی کے ملازمین کو دیسی زبانیں، اور بالخصوص اُردو سکھانے، اور مقامی آبادی کی تہذیب و تاریخ، نفسیات و معاشرت اور اندازِ فکر سے واقف کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ فورٹ ولیم کالج اور اس کا کارنامہ متعدد اہل تحقیق

کی توجہ کا مرکز رہا ہے، اور اس موضوع پر بہت محنت اور عرق ریزی سے لکھی ہوئی چند کتابیں بآسانی دستیاب ہیں(۱۱)، اس لیے تفصیل میں جائے بغیر یہ بتانا ہی کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے جہاں تدریسی ضرورت کے لیے طبع زاد کتابیں تصنیف کیں، وہاں فارسی متون کو من و عن یا کچھ حک و اضافہ کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ۔

فورٹ ولیم کالج کی اُردو تصنیفات اور ان میں تراجم کا حصہ

فورٹ ولیم کالج کی تاریخ اور کارکردگی کا جائزہ لینے والوں میں سے ایک، جناب سمیع اللہ کی تحقیق کے مطابق کالج کے وابستگان نے اس کی ترپن سالہ تاریخ میں انگریزی اور اردو میں چھوٹی بڑی ۱۴۷ کتابیں لکھیں، جن میں سے ۹۴ طبع ہوئیں اور ۵۳ غیر مطبوعہ رہ گئیں(۱۲)۔ ان ۱۴۷ کتابوں میں سے ۱۲۲، یعنی ۸۳ فیصد کتابیں کالج کے ابتدائی بارہ برسوں میں لکھی گئیں، باقی ماندہ اگلے سترہ برسوں میں (تا ۱۸۲۹ء) تالیف ہوئیں، صرف ایک کتاب ۱۸۴۱ء میں لکھی گئی جو کالج کی آخری کتاب ثابت ہوئی۔

ان جملہ کتابوں میں سے ۲۹ فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے پالیسی سازوں نے ترجمے کے لیے تاریخ و تذکرہ، اخلاق اور داستانی ادب کو اہمیت دی۔ تاریخ میں ''روضۃالشہداء'' (حسین بن علی واعظ کاشفی)، ''شاہنامۂ فردوسی'' کے خلاصے ''تاریخ شمشیرخانی''(مرزا توکل بیگ) کے ساتھ تاریخ برصغیر کے متون —— ''فتحیہ عبریہ'' (شہاب الدین احمد بن ولی طالش)، ''تاریخ شیر شاہی'' (عباس خان شروانی)، ''اکبرنامہ'' (ابوالفضل)، ''توزکِ جہانگیری'' (نورالدین جہانگیر)، ''تاریخ فرشتہ'' (محمد قاسم فرشتہ)، ''تاریخ جہانگشای نادری'' (مرزا محمد مہدی خان استرآبادی) اور ''خلاصۃالتواریخ'' (سجان رائے بٹالوی) ——کے جزوی یا مکمل ترجمے کرائے گئے۔ ''روضۃ الشہداء'' کا ایک ترجمہ شیخ محمد بخش نے ''دہ مجلس'' کے نام سے کیا (۱۸۰۳ء) جو شائع نہ ہو سکا۔ دوسرا ترجمہ حیدر بخش حیدری نے ''گلشن شہیداں'' کے نام سے مکمل کیا (۱۸۱۰ء)، مگر آج اس کا کوئی وجود نہیں، البتہ اس ترجمے کی تلخیص ''گل مغفرت'' (حیدر بخش حیدری) دستیاب ہے۔

اخلاق کے حوالے سے جن متون کو اردو کا جامہ پہنایا گیا، ان میں ''پندنامہ'' (فریدالدین عطار)، ''گلستان'' (مصلح الدین سعدی شیرازی)، ''کریما'' (منسوب بہ سعدی)، ''اخلاق جلالی'' (جلال الدین دوانی)، ''اخلاقِ محسنی'' (ملا حسین بن علی واعظ کاشفی)، اور 'ہفت گلشن'' (ناصر علی خان واسطی بلگرامی) شامل ہیں۔

منظوم و منثور داستانی ادب میں ''کلیلہ و دمنہ'' کی کہانیوں کے حوالے سے ''عیار دانش'' (ابوالفضل) اور ''مفرح القلوب = گیتک دمنک'' (تاج الدین مفتی) کا انتخاب کیا گیا۔ عشقیہ داستانوں میں سے 'ہفت پیکر' (نظامی گنجوی)، ''لیلیٰ مجنوں'' (امیر خسرو)، ''نل دمن'' (ابوالفیض فیضی)، ''بہار دانش'' (عنایت اللہ کنبوہ لاہوری)، ''قصہٴ گل بکاولی'' (عزت اللہ بنگالی) اور ''قصہٴ حسن و عشق یا گل و ہرمز'' چنی گئیں۔ ان سب ہی داستانوں کا ایک ایک ترجمہ ہوا، مگر ''بہار دانش'' کو محمد اسماعیل معروف بہ مرزا جان طپش نے چار ہزار سے زائد اشعار میں منتقل کیا (۱۲۱۷ء= باغ و بہار)، جبکہ اسی سال حیدر بخش حیدری نے ''بہارِ دانش'' کو ''گلزارِ دانش'' کے نام سے اردو کے نثری قالب میں ڈھال دیا(۱۳)۔

فورٹ سینٹ جارج کالج -مدراس

فورٹ ولیم کالج - کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام سول ملازمین کو تین سال تک کے لیے زبان و ادب کی لازمی تعلیم دی جاتی تھی، چنانچہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس تینوں پریذیڈنسیوں کے ملازمین یہاں آتے تھے، لیکن کالج کے قیام کے پانچویں برس مدراس اور بمبئی کے ملازمین کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں فورٹ ولیم کالج کے طرز پر بمبئی اور مدراس میں ادارے قائم کیے گئے۔ بمبئی کے کالج کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں، البتہ مدراس میں ۱۸۱۲ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج قائم کیا گیا جس میں عربی، فارسی اور اُردو کے اساتذہ کے ساتھ کنٹری، تامل اور ملیالم جاننے والے مدرسین فراہم کیے گئے تھے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج - مدراس نے تقریباً ۴۲ سال کام کیا، تاہم اس کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیاں تاسیس کے ۲۷ برس بعد ۱۸۳۵ء میں ماند پڑ گئی تھیں۔ کالج کے اساتذہ نے کتنی کتابیں تصنیف و تالیف کیں؟ وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم جناب سمیع اللہ نے کالج کی ۳۱ کتابوں کا ذکر کیا ہے(۱۴)۔ ان ۳۱ کتابوں میں سے تین فارسی سے بایں تفصیل ترجمہ کی گئی ہیں:

- انوار سہیلی (حسین بن علی واعظ کاشفی کی اِسی نام کی تالیف کا ترجمہ) از محمد ابراہیم خان بیجاپوری
- سنگھاسن بتیسی (ترجمہ تالیف، چتربھج داس) از ناشناس
- ترجمہٴ گلستان سعدی، سہ باب از ناشناس

انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنۂ ملکی

فورٹ ولیم کالج - کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج - مدراس تو کمپنی کے انگریز ملازمین کو اہل برصغیر کی معاشرت سے آگاہ کرنے، اور انہیں اردو زبان سکھانے کے لیے قائم ہوئے تھے، مگر اسی دور میں روایت دوست اہلِ برصغیر کو مغربی علوم و افکار سے باخبر کرنے کے لیے مدرسۂ غازی الدین - دہلی کو ''دہلی کالج'' (اورینٹل کالج- دہلی، تاسیس: ۱۸۲۵ء) کی شکل دی گئی۔ مولوی عبدالحق کے بقول ''اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی --- کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی، لیکن دوسرے علوم جو داخلِ نصاب تھے، ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو ہی تھا''(۱۵)۔ اردو زبان کا دامن وسیع کرنے کے لیے ''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی یا Society for the Promotion of Knowledge in India through the Medium of Vernacular Languages کی داغ بیل ڈالی گئی (۱۸۴۳ء) جس کے مقاصد میں ''انگریزی، سنسکرت، عربی، فارسی کی اعلیٰ درجے کی [کتابوں کو] اردو، بنگالی، ہندی میں ترجمہ'' کرنا شامل تھا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء کے ایک خط میں دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر بتروس نے لکھا ہے:

> تقریباً چھ مہینے سے میں نے کوئی بیس مترجم کالج میں ملازم رکھے ہیں۔ یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے علاوہ انگریزی کی بعض کتابیں متعلق بہ علوم طبیعیات، معاشیات، تاریخ ، فلسفہ، قانون اور برطانوی ہند میں رائج الوقت قانون کی کتابیں اردو میں ترجمے کرتے ہیں(۱۶)۔

''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی'' (جو بعدازاں ''ورنیکلر سوسائٹی'' کے مختصر نام سے معروف ہوئی) نے جو کتابیں ترجمہ کیں، یا جن کی اشاعت کی جانب توجہ دی، ان کی ایک فہرست مولوی عبدالحق نے فراہم کی ہے، جس میں ۱۲۸ کتابیں شامل ہیں(۱۷)۔ ان میں سے آٹھ دس کتابیں فارسی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ تاریخ کے حوالے سے مولوی سبحان بخش نے ''تزک تیموری''(۱۸) (اشاعت: ۱۸۴۵ء) ، منشی میراشرف علی نے محمد اعظم دیدہ مری کی ''تاریخ اعظمی = واقعات کشمیر'' اور منشی مول چند کائستھ دہلوی نے ''تاریخ شمشیر خانی'' (خلاصہ شاہنامہ فردوسی) کا ترجمہ کیا۔ اخلاق و آداب کے حوالے سے مولوی حسن علی خان نے ''گلستانِ سعدی'' اور ایک دوسرے مترجم نے سدیدالدین محمد عوفی کی ''جوامع الحکایات و لوامع الروایات'' کو ترجمے کے لیے پسند کیا۔ امام بخش صہبائی نے بلاغت کے موضوع پر شمس الدین فقیر کی معروف کتاب ''حدائق البلاغت'' کو اردو میں منتقل کیا، اور سید احمد خان

نے اپنے نانا دبیرالدولہ فریدالدین (م ۱۸۲۸ء) کے رسالہ ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' کا اردو ترجمہ کیا(۱۹)۔

متقبول فارسی متون کے مکرّر ترجمے

فورٹ ولیم کالج، فورٹ سینٹ جارج کالج اور دہلی کالج کے مترجمین نے جو کتابیں ترجمے کے لیے چنی تھیں، ان میں سے بعض متعدد دوسرے اہلِ ذوق کی توجہ کا بھی مرکز بنیں۔ کیا یہ اردو کتابوں کی مقبولیت تھی کہ خوب سے خوب تر ترجمے کی ضرورت اہلِ قلم کے لیے مہمیز بن گئی تھی، یا ایک ہی متن کے یکے بعد دیگرے ترجمے معاصرانہ چشمک کے تحت اظہارِ زبان دانی کی مشق تھے؟۔ غالبًا یہ دونوں رویے ساتھ ساتھ کارفرما تھے۔ مثال کے طور پر ''تاریخ شمشیر خانی'' کو ۱۰۶۵ھ/ ۵۵ - ۱۶۵۴ء میں نذر علی ''سراج التواریخ'' کے نام سے نظم کر چکے تھے، فورٹ ولیم کالج کے لیے محمد علی نے ''تاریخ شمشیر خانی'' کا ترجمہ کیا، پھر منظوم ترجمہ ''قصہ خسروانِ عجم'' (= ۱۲۲۵ھ) سامنے آیا، اور آخر میں واجد علی شاہ اختر کی فرمائش پر اسے رجب علی بیگ سرور (م ۱۸۶۹ء) نے اضافات کے ساتھ ''سرورِ سلطانی'' کے نام سے مرتب کیا (۱۲۶۳ھ/ ۴۷-۱۸۴۶ء)۔

میر شیر علی افسوس اور مولوی حسن علی خان کے تراجم کے علاوہ ۱۸۵۷ء تک ''گلستان'' کے جو چند مزید ترجمے ہوئے، ان میں سے بعض کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، مگر ان کے مترجمین کے بارے میں کوئی اطلاع دستیاب نہیں(۲۰)۔ دو معروف ترجموں میں سے ایک غیر مطبوعہ منظوم ترجمہ فریدالدین آفاق دہلوی کا ہے جو ۱۲۳۳ھ/ ۱۸-۱۸۱۷ء میں چار ہزار اشعار میں مکمل ہوا تھا(۲۱)۔ دوسرا ترجمہ موتی لال کا ہے جو ۱۸۴۷ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا(۲۲)۔

''نل دمن'' کے تین مزید ترجمے(۲۳)، ایک نثر میں، اور دو نظم میں، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کے تراجم کے علاوہ ہیں۔ الٰہی بخش شوق اکبر آبادی نے ۱۲۱۷ھ/ ۰۳-۱۸۰۲ء میں اسے اردو میں منتقل کیا تھا، اس ترجمے کا نسخہ برٹش میوزیم - لندن میں محفوظ ہے، اوربھگونت رائے راحت نے ''مثنوی نل دمن''، اس کے سولہ برس بعد نظم کی (۱۲۳۳ھ/ ۱۸-۱۸۱۷ء)، منشی کالی پرشاد کا منظوم ترجمہ ۱۸۴۵ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔

''بہارِ دانش'' (عنایت اللہ کنبوہ) کے دو ترجمے (ایک منظوم اور ایک منثور) فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے کیے، مزیدترجموں میں فریدالدین آفاق دہلوی کا ''گلزارِ دانش''، عابد حسین عظیم آبادی کا ''قصۂ غم ربا'' (سال ترجمہ ۱۲۴۳ھ/ ۲۸-۱۸۲۷ء) اور ولایت علی بن شیخ محمد بخش کا ''گلشنِ دانش''

(سال ترجمہ ۱۲۶۸ھ/ ۵۲-۱۸۵۱ء) شامل ہیں۔

''مفرح القلوب'' (عرف ''گیتک دمنک'') کلیہ و دمنہ کی داستان پر مبنی ہے جس کا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے میر بہادر علی حسینی نے ''اخلاق ہندی'' کے نام سے کیا تھا۔ اسی داستان پر مبنی دوسرا فارسی متن حسین بن علی واعظ کاشفی کی تالیف ''انوارِ سہیلی'' ہے جس کا ایک ترجمہ محمد ابراہیم بیجاپوری نے کیا تھا جو ''دکنی انوارِ سہیلی'' کے طور پر مشہور ہوا۔ ''انوارِ سہیلی'' کے مزید تراجم میں فریدالدین آفاق دہلوی کا منظوم ترجمہ ''مثنوی دانش افروز'' (سالِ نظم ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء) اور فقیر محمد خان گویا کا ''بستانِ حکمت'' (سال نگارش، ۱۲۵۱ھ/ ۳۶-۱۸۳۵ء) نمایاں ہیں۔ ایک اور جزوی ترجمہ، باب ہشتم تا باب دوازدہم آگرے سے شائع ہوا تھا (مطبع اسدالاخبار، ۱۲۶۹ھ)۔

''طوطی نامہ'' (ضیاء الدین نخشبی) کا منتخب ترجمہ غواصی دکنی نے کیا تھا۔ یہی قصہ اختصار کے ساتھ سیّد محمد قادری نے لکھا تھا جس کا ترجمہ حیدر بخش حیدری نے ''توتا کہانی'' کے زیرِعنوان کیا۔ سیّد محمد قادری کے فارسی متن کو غالباً حیدر بخش حیدری کے ترجمے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی، اور ۱۸۵۷ء تک اس کے کم از کم دو اور ترجمے کیے گئے۔ ۱۲۲۰ھ/ ۰۶-۱۸۰۵ء کے ایک ترجمے کے خالق کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں، البتہ دوسرے مترجم، داستان گو انبا پرشاد ہیں (ترجمہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء)۔

''قصۂ حاتم طائی'' پر مبنی ''آرائشِ محفل'' (حیدر بخش حیدری) سے اردو ادب کے شائقین واقف ہیں، مگر اس سے ایک برس پہلے کے منظوم ترجمہ ''قصۂ حاتم طائی'' سے زیادہ لوگ آگاہ نہیں (سال نظم، ۱۲۱۵ھ/ ۰۱-۱۸۰۰ء)۔

''گل باصنوبر'' کی یہ مقبولیت تھی کہ اسے اٹھارہویں صدی میں محمد علی عاجز نے نظم کیا۔ انیسویں صدی میں رائے بنی نرائن جہاں نے فورٹ ولیم کالج کے لیے ''نوبہار'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا، مگر بنی نرائن جہاں سے پہلے باسط خان نے ''گلشنِ ہند'' (سال ترجمہ ۱۲۱۸ھ/ ۰۴-۱۸۰۳ء) اور نیم چند کھتری نے ''گل باصنوبر'' کے اصل نام سے اس کے ترجمے کیے (اشاعت ۱۲۴۸ھ/ ۳۳-۱۸۳۲ء)۔

عزت اللہ بنگالی کے فارسی متن ''گل بکاولی'' کو نہال چند لاہوری نے ''مذہب عشق'' (=۱۲۱۷ھ) کی شکل میں ترجمہ کیا، مگر اس سے پانچ برس پہلے ریحان نامی شاعر نے اسے ''مثنوی گلگشت'' کے نام سے اردو دانوں کے حضور میں پیش کیا تھا۔

مولانا جامی کی مثنوی ''یوسف و زلیخا'' صدیوں تک درسی کتاب کی حیثیت سے متداول رہی ہے۔ اپنی مقبولیت کے تحت بجاطور پر یہ ان فارسی متون میں سے ہے جن کے تراجم ابتداء میں ہوئے۔

امین گودھروی کے ترجمے کے علاوہ ''دہلی کالج'' کے کارپردازوں نے بھی اس کا ترجمہ کیا، تاہم انیسویں صدی میں (تا ۱۸۵۷ء) اس کے مزید منظوم ترجمے ہوئے۔ ایک ترجمہ مجیب اللہ نامی شاعر نے ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء میں کیا تھا۔

فارسی اوراردو کے داستانی ادب میں ''قصۂ چہار درویش'' کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ ایک عرصے تک اسے امیر خسرو کی تخلیق سمجھا جاتا رہا، مگر حافظ محمود شیرانی نے محکم دلائل کے ساتھ اس غلطی کی تصحیح کی، اور اسے عہدِ محمد شاہ (۱۷۱۸-۱۷۴۸ء) کے حکیم محمد علی معصوم کی تالیف قرار دیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں میر محمد حسین عطا خان تحسین نے اس کا نثر میں ''نوطرز مرصع'' کے نام سے اور محمد علی خان شوق نے نظم میں ''یادگارِ زمانہ'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے میر امن دہلوی کی کتاب ''باغ و بہار'' (تالیف ۱۸۰۳ء) ''نو طرزِ مرصع'' پر مبنی ہے، تاہم انیسویں صدی کے آغاز میں ایک اور منظوم ترجمہ عنایت اللہ خان سرشار کی مشقِ سخن کے نتیجے میں سامنے آیا۔

''چہار درویش'' کو غلام غوث زرّیں بجنوری نے حک و اضافۂ مطالب کے ساتھ پہلے منشیانہ فارسی نثر میں لکھا تھا، اور پھر خود ہی اسے اردو میں منتقل کیا (سالِ تکمیل، ۱۲۱۷ھ/ ۰۳-۱۸۰۲ء)۔

داستانی ادب کے تراجم میں انیسویں صدی میں ''بوستانِ خیال'' (میر محمد تقی احمد آبادی) کے تراجم ہوئے۔ عالم علی عظیم آبادی نے ''زبدۃ الخیال'' کے نام سے ترجمہ و تلخیص مرتب کی (۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء)۔ مہدی علی خان زکی مراد آبادی، شیخ علی بخش بیمار اور بدرالدین خان معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے اس کے جزوی ترجمے کیے۔

امیر خسرو کی ''ہشت بہشت'' کا منظوم ترجمہ ملک خوشنود نے محمد عادل شاہ بہمنی کے عہد میں کیا تھا (۱۰۵۰ھ/ ۴۱ - ۱۶۴۰ء)۔ انیسویں صدی کے آغاز میں غلام احمد دہلوی نے ''ہشت بہشت'' کو فارسی نثر سے اردو نثر میں ''ہشت کنشت'' کے نام سے منتقل کر دیا (۱۲۱۷ھ = باغ وبہار)۔ اس کا خطی نسخہ مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی (ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ) کے ذاتی ذخیرے میں تھا(۲۴)۔ اس کے بعد شاہ حسین حقیقت (شاگرد جرأت) نے ''ہشت بہشت'' کو فارسی نظم سے فارسی نثر میں منتقل کیا، اور پھر فارسی نثر سے اردو ترجمہ ۴۷۶۵ اشعار میں ''مثنوی ہشت گلزار'' کے نام سے کیا (اتمام تصنیف، ربیع الاول ۱۲۲۵ھ/ اپریل ۱۸۱۰ء)۔

فارسی شعراء میں سے حکیم عمر خیام کی رباعیات اور مولانا روم کی مثنوی کو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہے، مگر ان کے اردو تراجم کی طرف ذرا تاخیر سے توجہ دی گئی۔ آج ان کے جزوی اور مکمل،

متعدد نثری اور منظوم ترجمے دستیاب ہیں، تاہم ۱۸۵۷ء تک مثنوی کا کامل منظوم ترجمہ ''پیراہن یوسفی'' تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ مثنوی کے بعض منتخب حصوں کا منظوم ترجمہ ''باغِ ارم'' کے نام سے منشی مستعان علی نے کیا تھا (سالِ نظم، ۱۲۴۴ھ/ ۲۹ - ۱۸۲۸ء)۔

انیسویں صدی کے نصف اول کے تراجم

وقت کے ساتھ ساتھ اردو نے جب فارسی کی جگہ لے لی، اور عامۃ الناس کی تدریسی و تعلیمی ضرورتوں کے تحت اس میں مستقل بالذات کتابیں لکھی جانے لگیں، تو ماضی کے دینی سرمائے کو بھی اردو میں منتقل کیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں فقہی مسائل پر جو کتابیں ترجمہ ہوئیں، ان کی تفصیل یہ ہے(۲۵):

- کشف الخلاصہ (ترجمۂ منظوم، ''خلاصۃ الفقہ''، عبداللطیف لاہوری) از شجاع الدین برہان پوری
- حدائقِ اثنا عشری (ترجمہ ''رسالہ سیفیہ در مسائل فقہیہ''، سید مہدی علی بن سید مقصود علی) از سید سیف الدین حیدری
- رسالہ نکاح (اسی نام کے رسالے کا ترجمہ، ملا محمد باقر مجلسی) از محمد حسین آزاد
- کشف الحاجہ (ترجمہ ''ما لا بدمنہ''، قاضی ثناء اللہ پانی پتی) از محمد نورالدین چاٹگامی
- رسالہ عقیقہ (ترجمہ ''عجالۃ الدقیقہ فی مسائل العقیقہ''، تراب علی لکھنوی) از محمد نظام شاہجہاں پوری
- مسائلِ موتیٰ (ترجمہ) از سعید بخت

انیسویں صدی میں سیّد احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد کے قلم کاروں نے چھوٹی بڑی متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ ان اہل قلم نے خانوادۂ ولی اللہی کے علماء —— شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحاق —— کی بعض کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ شاہ رفیع الدین کے رسالوں میں ایک رسالہ ''تنبیہ الغافلین'' ہے، اس کا پہلا ترجمہ رائے بنی نرائن جہاں نے کیا تھا، اسی ترجمے کی بنیاد پر گارساں دتاسی کو غلط فہمی ہوئی کہ بنی نرائن جہاں نے اسلام قبول کر لیا تھا(۲۶)۔ بنی نرائن جہاں کا ترجمہ کبھی طبع نہ ہو سکا، البتہ محسوس ہوتا ہے کہ متداول ضرور رہا ہے(۲۷)۔ ''تنبیہ الغافلین'' کا دوسرا ترجمہ فورٹ ولیم کالج کے منشی میر بہادر علی حسینی کے صاحبزادے سیّد عبداللہ نے کیا تھا جو تحریکِ جہاد کے ایک نمایاں ناشرِ کتب تھے۔ انہوں نے ہوگلی میں مطبع احمدی قائم کیا تھا، اسی مطبع سے ان کا یہ ترجمہ چھپا تھا، تیسرا ترجمہ امین الدین اور محمد تقی وغیرہ نے مل کر کیا تھا، جو چند بار

چھپا ہے۔

شاہ رفیع الدین کا ایک دوسرا رسالہ ''قیامت نامہ'' ہے جس کا پہلا ترجمہ سیّد عبداللہ بن میر بہادر علی حسینی سے یادگار ہے (سال ترجمہ ۱۲۳۹ھ/ ۲۴-۱۸۲۳ء)، اور دوسرا ترجمہ نظم میں محمد علی محمد نے ''آثارِ محشر'' کے نام سے ۱۲۵۱ھ/ ۳۶-۱۸۳۵ء میں کیا تھا۔

شاہ محمد اسحاق دہلوی کی جانب اصلاحی نوعیت کی دو کتابیں ''مائۃ مسائل'' اور ''مسائل اربعین فی بیان سنت سیّد المرسلین'' منسوب ہیں۔ اول الذکر کو احمداللہ بن دلیل اللہ صدیقی نے اردو کا جامہ پہنایا تھا (۱۲۴۵ھ/ ۳۰-۱۸۲۹ء)۔ ثانی الذکر کا ترجمہ پہلے سیّد عبداللہ بن میر بہادر علی حسینی نے کیا، پھر اس کا ترجمہ اور تشریح سعدالدین عثمانی بدایونی نے ''رفاہ المسلمین فی شرح مسائل اربعین'' کے نام سے لکھی (۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء)، اور دوسرا ترجمہ ملا محمد نظام شاہجہاں پوری نے ''تحفۃ المسلمین'' کے نام سے کیا (اشاعت : ۱۲۶۶ھ)۔

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی ''تفسیر عزیزی'' کے آخری دو پاروں کا ترجمہ مولوی محمد حسن خان رامپوری نے کیا جو بمبئی سے ایک ایک پارے کی شکل میں بالترتیب ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ شاہ صاحب کی دوسری اہم تالیف ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے دو ابواب (باب دہم، باب دواز دہم) کو سرسیّد احمد خان نے ''تحفۂ حسن'' کے نام سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔

تحریک جہاد و اصلاح کے ایک قلم کار نواب قطب الدین خان نے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی (م۱۶۴۲ء) کی تالیفات ـــــ ''آداب الصالحین'' اور ''مطلب الاعلیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' ـــــ کو بالترتیب ''ہادی الناظرین'' (اشاعت، دہلی: ۱۲۶۳ھ) اور ''زادالعقبیٰ'' (اشاعت، لکھنؤ: ۱۲۶۹ھ) کے ناموں سے اردو میں منتقل کیا۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی ایک دوسری تالیف ''ترغیب اہل السعادات فی تکثیر الصلوٰۃ علی سیّد الکائنات'' کو کفایت علی کافی نے ''خیابانِ فردوس'' کے نام سے نظم کیا (۱۲۶۷ھ/ ۵۱-۱۸۵۰ء)۔

دینیات کے ضمن میں امام غزالی کی ''کیمیائے سعادت'' نہایت مقبول کتاب رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء تک اس کے ترجمے کی جو کوششیں کی گئیں، ان میں پہلی کوشش ''ہدیۃ العارفین'' کے نام سے عالم علی عظیم آبادی کی ہے (اشاعت، کلکتہ: مطبع مرآۃ الاخبار، ۱۲۶۷ھ/ ۵۱ - ۱۸۵۰ء)۔ دوسری کوشش محمد مہدی واصف کی ''منہاج العابدین'' کی شکل میں ہے جو ۱۲۷۰ھ/ ۵۴ - ۱۸۵۳ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ ''کیمیائے سعادت'' کے دیباچے کا ترجمہ سرسیّد احمد خان سے بھی یادگار ہے (اشاعت: ۱۲۷۰ھ /

۱۸۵۳-۵۴ء)۔

تاریخ و سوانح کے حوالے سے باذل مشہدی کی تالیف ''حملۂ حیدری'' اور ملا محمد باقر مجلسی کی ''حیات القلوب'' معروف کتابیں ہیں۔ اول الذکر کو محمد نوروز حسن بلگرامی نے اُردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے (تالیف بعد از ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء، غیر مطبوعہ)۔ آخرالذکر کو تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' کے مرتب سعادت خان ناصر نے ''کشف حیات القلوب'' (= ۱۲۷۱ھ) کے نام سے نظم کیا ہے، مگر اس کے کسی خطی نسخے کی موجودگی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔

انیسویں صدی میں مذکورۃ الصدر موضوعات کے ساتھ قواعد و انشاء، سوانح و تذکرہ اور طب وغیرہ کی بعض کتابیں اردو میں منتقل کی گئی تھیں، ان میں سے اکثر کا اندراج ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبانہای پاکستانی'' میں کیا گیا ہے۔

فارسی سے اردو میں ترجمے کی روایت پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ فارسی سے ہونے والے تراجم میں بتدریج اضافہ ہوا ہے، تاہم موضوعات میں زیادہ تنوع نہیں رہا۔ ابتداء میں داستانی ادب (بشمول مذہبی داستانی ادب) پر زیادہ زور تھا اور یہ رجحان انیسویں صدی کے وسط تک قائم رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبیات، اخلاق اور تاریخ و سوانح کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ابتداء میں تصوف کے دقیق مسائل نے زیادہ توجہ حاصل کی، اور بعد میں عامۃالمسلمین کی روزمرہ زندگی کے دینی مسائل نمایاں ہوئے۔ کلاسیکی ادبی متون کے ترجموں میں مترجمین نے خوب سے خوب تر کی کوشش کی ہے، منظوم متون کے نثری اور منظوم دونوں طرح کے تراجم کی کوششیں ہوئی ہیں، تاہم فارسی سے اردو کا اکتسابِ فیض تاحال جاری ہے، البتہ ترجمے کے لیے منتخب کیے گئے متون کے تنوع میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔

حواشی

۱- رابعہ بنت کعب کو عوفی نے ''لباب الالباب'' میں قزداری لکھا ہے۔ عبدالشکور احسن نے قزدار کو بلوچستان کا قصبہ خضدار قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عبدالشکور احسن، Studies in Persian Language and Literature لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۲ء، صفحات ۴۹-۵۸؛ وہی مصنف، ''مقالاتِ احسن'' (مرتبہ آفتاب اصغر، معین نظامی)، لاہور: شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۹۹ء، صفحات ۳۰۶-۳۰۷، نیز ۳۲۱-۳۲۳۔ رابعہ بنت

کعب کی شخصیت دانش اور حسن دونوں کی جامع تھی۔ اسے اپنے بھائی حارث کے غلام بکتاش سے عشق تھا، جس کا چرچا ہونے پر حارث نے رابعہ کو قتل کرایا تھا۔ شیخ فریدالدین عطار (م ۱۲۳۰ء) نے اس کے عشق کی داستان ''الٰہی نامہ'' میں قلمبند کی ہے۔ دیکھیے: ''الٰہی نامہ''، تہران: باہتمام فواد روحانی، ۱۳۳۹ھ ش، صفحات ۲۵۹-۲۷۵۔ رابعہ کی زندگی کے لیے دیکھیے: انعام الحق کوثر، ''جوئے کوثر''، کوئٹہ: بابر سٹیشنری مارٹ، دسمبر ۱۹۷۶ء، صفحات ۲۲-۲۷

۲- ''تاریخ سلاطین اہلِ غزنین'' کا یہ اقتباس شیخ محمد اکرام (م ۱۹۷۳ء) نے اپنی مختلف تحریروں میں نقل کیا ہے، مگر کہیں کتاب کا پورا حوالہ نقل نہیں کیا، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقتباس صحیح طور پر نقل ہوا ہے یا نہیں۔ اقتباس کے لیے دیکھیے: ''آبِ کوثر''، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۱ء (اشاعتِ اوّل: ۱۹۴۱ء)، صفحات ۶۵-۶۶؛ ''ارمغانِ پاک''، کراچی: ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، ۱۹۵۹ء (اشاعتِ اوّل : ۱۹۵۰ء)، صفحات ۱۶-۱۷

۳- جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اردو، جلد اول (قدیم دور)، آغاز سے ۱۷۵۰ء تک''، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۲۳

۴- مثال کے طور پر دیکھیے: رشید احمد صدیقی، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، ''علی گڑھ میگزین'' (علی گڑھ)، غالب نمبر، بابت ۴۹ - ۱۹۴۸ء؛ نیز ''نقد غالب'' (مرتبہ مختار الدین احمد)، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۳۳۵

۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت کے بارے میں دیکھیے: سیّد عبداللہ، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت فارسی زبان کی حالت، ''فارسی زبان و ادب''، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، صفحات ۳۲۵-۳۳۷

۶- ''معراج العاشقین'' کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۱۴۲۱ء) کی تصنیف سمجھتے ہوئے اسے اردو کی قدیم ترین نثری کتاب قرار دیا جاتا رہا ہے، اور اسی حوالے سے اس کا درسی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔ ''معراج العاشقین'' کو پہلی بار خواجہ بندہ نواز کی جانب نسبت دیتے ہوئے بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مرتب کیا تھا (اورنگ آباد: تاج پریس، ۱۳۴۳ھ [۱۹۲۴ء])، بعد میں خلیق انجم (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۷ء)، گوپی چند نارنگ (دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۵۷ء) اور تحسین سروری (۱۹۶۱ء) نے اپنے اپنے ذوقِ نظر کے مطابق اسے مرتب کیا، مگر اس کے اوّلیں مرتب مولوی عبدالحق نے اپنی رائے بدل لی تھی، یا اُنھیں اپنی سابق رائے پر کم از کم اصرار نہ رہا تھا۔ اِس بات کا اظہار اُن کے ایک مضمون ''اُردو زبان و ادب'' سے ہوتا ہے جو اُن کی رحلت کے بعد ماہنامہ ''ہم قلم'' (کراچی) میں شائع ہوا۔ اِس مضمون میں اُنہوں نے لکھا ہے:

> ''اخبار الاخیار'' تصنیف شیخ عبدالحق محدّث دہلوی اور ''جوامع الکلم'' تالیف سیّد حسین المعروف بہ سیّد محمد اکبر حسین فرزند اکبر خواجہ بندہ نواز جس میں حضرت کے ملفوظات و حالات وغیرہ تفصیل سے درج ہیں، نیز دیگر کتابوں میں حضرت کا تذکرہ ہے، کہیں اِس بات کا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ دکن یا قدیم اُردو میں بھی اُن کی کوئی تصنیف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے فارسی، عربی رسالوں کے ترجمے ہیں جو ان کے نام منسوب کر دیے گئے ہیں (''ہم قلم''، شمارہ اگست ۱۹۶۲ء، ص ۸۷)۔

مولوی عبدالحق کے تردّد کے باوجود ''معراج العاشقین'' کے مصنف کی تعیین ایک مسئلہ ہی رہا۔ آخر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے '''معراج العاشقین' کا مصنف'' (حیدر آباد دکن: مصنف، ۱۹۶۸ء) میں اِسے گیارہویں صدی کے نصف آخر اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل / سترہویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی ایک تالیف ''تلاوۃ الوجود'' کا ناقص اور بے ربط خلاصہ قرار دیا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کاوش کو ''غلط انتسابات کی تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ'' قرار دیتے ہوئے اس کا خلاصہ مرتب کیا ہے۔ دیکھیے: ''تحقیق'' (حیدر آباد)، شمارہ خاص ۱۰-۱۱ (۹۷-۱۹۹۶ء)، صفحات ۸۶۳-۸۷۶۔

۷- جمیل جالبی، حوالہ مذکورہ، ص ۴۳۴۔ جناب جالبی کے نزدیک ''کہیں کہیں 'سب رس' اور 'تاج الحقائق' کے موضوعات ایک دوسرے سے ضرور ٹکرا جاتے ہیں، لیکن یہ وہ موضوعات ہیں جو اس زمانے میں عام تھے اور ان کی تأویل ہر شخص اپنے اپنے انداز میں کرتا تھا۔ 'تاج الحقائق' کے مصنف وجیہ الدین محمد ہیں۔ --- اس کتاب ('تاج الحقائق') کو ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں سیّد ابصار علی شاہ ابن سیّد اکبر علی شاہ قادری نے عام فہم زبان ہندی میں لکھا'' (صفحات ۴۳۴ - ۴۳۵)۔

۸- اسلام آباد: مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۸۶ء۔

۹- فارسی سے اُردو تراجم کے سلسلے میں زیادہ تر انحصار ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبان ہای پاکستانی'' پر رہا ہے، مضمون میں اِن تراجم کے خطی نسخوں یا مطبوعہ اشاعتوں کا ذکر نہیں کیا گیا، اِس کے لیے مذکورہ اصل مأخذ سے رجوع کیا جائے۔

۱۰- خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ ''گنج خوبی'' (میر امن دہلوی) ، دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، ص ۳

۱۱- فورٹ ولیم کالج کے بارے میں اردو ادب کی تاریخوں میں مستقل ابواب کے علاوہ جو متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں: ● سیّد محمد بی- اے (عثمانیہ)، ''ارباب نثر اُردو''، حیدر آباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ ، ۱۹۲۷ء ● نادم سیتاپوری، ''فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی''، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۵۹ء ● محمد عتیق صدیقی، ''گل کرسٹ اور اس کا عہد''، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۹ء (اشاعت اوّل: ۱۹۶۰ء) ● عبیدہ بیگم، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء ● سید وقار عظیم ، ''فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ''، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء ● سمیع اللہ، ''فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ''، ٹانڈہ فیض آباد: مؤلف، ۱۹۸۹ء ● David Copf, British Orientalism and the Bengal Renaissance، برکلے : یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، ۱۹۶۹ء

۱۲- سمیع اللہ، ''فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ''، حوالہ مذکورہ، ص ۸۳۔ فورٹ ولیم کالج جو کتابیں شائع نہیں کر سکا تھا، ان میں سے بعض برصغیر کی آزادی کے بعد مقامی اہلِ علم نے شائع کر دی ہیں۔

۱۳- فورٹ ولیم کالج کے سرمایۂ علم و ادب میں حسب ذیل کتب فارسی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ ان میں سے جو کتابیں تاحال غیر مطبوعہ ہیں، ان کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

● تاریخ و تذکرہ

''آرائشِ محفل'' (ترجمہ ''خلاصۃ التواریخ''، بٹالوی)، میر شیر علی افسوس

''تاریخ آشام [آسام] (ترجمہ ''فتحیہ عربیہ'')، میر بہادر علی حسینی ـــــ غیر مطبوعہ
''تاریخ بہمنی'' (جزوی ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'') ، کاظم علی جوان ـــــ غیر مطبوعہ
''تاریخ شیر شاہی'' (ترجمہ ''تاریخ شیرشاہی'')، مظہر علی خان ولا
''تاریخ نادری'' (ترجمہ ''تاریخ جہانگشای نادری'')، حیدر بخش حیدری ـــــ غیر مطبوعہ
''جہانگیرنامہ'' (جزوی ترجمہ ''توزک جہانگیری'')، مظہر علی خان ولا ـــــ غیر مطبوعہ
''دہ مجلس''، شیخ محمد بخش ـــــ غیر مطبوعہ
''شاہنامۂ ہند'' (ترجمہ ''تاریخ شمشیرخانی'')، محمد علی ـــــ غیر مطبوعہ
''گل مغفرت'' (خلاصۂ ترجمہ ''روضۃالشہداء'')، حیدر بخش حیدری
''گلشن ہند'' (ترجمہ ''گلزارِ ابراہیم'' ـــــ علی ابراہیم خلیل)، مرزا علی لطف
''واقعاتِ اکبر'' (جزوی ترجمہ ''اکبرنامہ'')، خلیل علی خان اشک ـــــ غیر مطبوعہ

● **اخلاق**

''باغِ اُردو'' (ترجمہ ''گلستان'')، میرشیر علی افسوس
''ترجمہ شیخ سعدی کے پندنامے کا'' (ترجمہ ''کریما'')، مظہر علی خان ولا
''جامع الاخلاق'' (ترجمہ ''اخلاق جلالی'')، امانت اللہ
''چشمۂ فیض (منظوم)'' (ترجمہ ''پندنامۂ عطار'')، معین الدین فیض ـــــ غیر مطبوعہ
[''پندنامۂ عطار'' کا ایک منظوم ترجمہ ''چشمۂ فیض'' کے نام سے مطبوعہ بھی ہے جو مولوی عبدالغفور نساخ (م۱۸۸۹ء) کی کاوش ہے۔ دہلی کالج کے مولوی احمد علی عباسی نے اسی نام سے اردو قواعد پر ایک کتاب بھی مرتب کی تھی]۔
''گنج خوبی'' (ترجمہ ''اخلاق محسنی'')، میرامن دہلوی
'ہفت گلشن'' (ترجمہ 'ہفت گلشن)، مظہر علی خان ولا

● **داستان**

''آرائش محفل: قصہ حاتم طائی'' (ترجمہ ''قصہ حاتم طائی'')، حیدر بخش حیدری
''اخلاق ہندی'' (ترجمہ ''مفرح القلوب'')، میر بہادر علی حسینی
''باغ عشق '' (ترجمہ ''لیلیٰ مجنوں''، عبدالرحمٰن جامی) ـــــ غیر مطبوعہ
''بہارِ دانش'' (منظوم ترجمہ، تالیف عنایت اللہ کنبوہ لاہوری)، مرزا جان طپش
''بہارعشق''، (ترجمہ ''نل دمن'')، نور علی ـــــ غیر مطبوعہ
''توتا کہانی'' (ترجمہ ''طوطی نامہ''، سیّد محمد قادری)، حیدر بخش حیدری
''حسن وعشق'' (ترجمہ ''گل و ہرمز'')، غلام حیدر عزت ـــــ غیر مطبوعہ
''خرد افروز'' (ترجمہ ''عیارِ دانش'')، حفیظ الدین بردوانی
''گلزارِ دانش'' (ترجمہ ''بہارِ دانش'')، حیدر بخش حیدری
''لیلیٰ و مجنوں'' (ترجمہ، مثنوی امیر خسرو)، حیدر بخش حیدری ـــــ غیر مطبوعہ
''مذہبِ عشق'' (ترجمہ ''گل بکاولی'')، نہال چند لاہوری

''نوبہار'' (ترجمہ ''گل وصنوبر'') ـــــ رائے بنی نرائن جہاں

''ہفت پیکر'' (ترجمہ مثنوی نظامی گنجوی)، حیدر بخش حیدری ـــــ غیر مطبوعہ

● **متفرق (خورونوش)**

''الوانِ نعمت'' (ترجمہ ''خوانِ نعمت'')، سیّد حمید الدین بہاری

۱۴- سمیع اللہ، ''انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے''، حوالہ مذکورہ، صفحات ۳۷۱- ۳۷۲

۱۵- مولوی عبدالحق ، ''مرحوم دہلی کالج''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۲ء، صفحات ۲۲ - ۲۳

۱۶- دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر بتروس کا خط، گارساں دتاسی کے نام، مکتوبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء، بحوالہ مولوی عبدالحق، حوالہ مذکورہ، ص ۸

۱۷- مولوی عبدالحق، حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۴۷ - ۱۵۳۔ جناب سمیع اللہ نے بھی ''دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کی تالیفات و تراجم کی فہرست مرتب کی ہے۔ دیکھیے: ''انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے''، ٹانڈہ فیض آباد: مؤلف، ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۲۵ - ۲۳۴

۱۸- ''تزکِ تیموری'' کو صاحب قراں امیر تیمور کی خودنوشت خیال کرتے ہوئے متعدد اہل علم نے اس سے اعتناء کیا ہے، مگر امیر تیمور کی جانب اس کا انتساب درست نہیں۔ دیکھیے: ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''فارسی زبان و ادب''، حوالہ مذکورہ، صفحات ۳۰۴ - ۳۰۸

۱۹- مولوی عبدالحق اور جناب سمیع اللہ کی فراہم کردہ فہرستوں، نیز ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبان ہای پاکستانی'' سے ''دہلی کالج'' کے حسب ذیل تراجم کا پتہ چلتا ہے:

تاریخ

''تاریخ کشمیر'' (ترجمہ ''تاریخِ اعظمی''، محمد اعظم دیدہ مری)، منشی اشرف علی، اشاعت مطبع العلوم، مدرسہ دہلی، ۱۸۴۶ء

''توزک تیموری'' (ترجمہ ''توزک تیموری''، منسوب بہ تیمور)، مولوی سبحان بخش، دہلی: دہلی اردو اخبار پریس، ۱۸۴۵ء

''خلاصۂ شاہنامہ'' یا ''قصۂ خسروانِ عجم'' (منظوم ترجمہ ''تاریخ شمشیر خانی'')، منشی مول چند کائستھ، دہلی: دہلی اردو اخبار پریس، ۱۸۴۴ء

اخلاق

''جامع الحکایات'' (جزوی ترجمہ ''جوامع الحکایات'')

''گلستان'' (ترجمہ ''گلستان'' سعدی)، مولوی حسن علی خان، دہلی: مطبع العلوم، ۱۲۶۵ھ/ ۴۹ - ۱۸۴۸ء

داستان

''زلیخا'' (''یوسف زلیخا'' جامی کا ترجمہ ہے)۔

''لیلیٰ مجنوں'' (منظوم)، محمد حسین تجلی عرف میاں جی، دہلی: مطبع رفاہ عام، ۱۸۴۴ء

''نل دمن'' (ترجمہ ''نل دمن'' فیضی)

بلاغت

''حدائق البلاغت'' (ترجمۂ تالیف شمس الدین فقیر)، امام بخش صہبائی، دہلی: لیتھوگراف پریس، ۱۸۴۳ء

ریاضیات

''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' (ترجمۂ تالیف فریدالدین)، سید احمد خان، دہلی: چھاپہ خانہ ''سید الاخبار''، ۱۸۴۶ء

۲۰- دیکھیے: اختر راہی، ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبان ہای پاکستانی''، حوالہ مذکورہ، صفحات ۲۴۶-۲۵۰، نیز صفحات ۴۱۸-۴۱۹

۲۱- ایضاً، ص ۲۴۸

۲۲- خلیل الرحمٰن داؤدی، ۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو مطبوعات، مشمولہ ''یادنامۂ داؤدی'' (مرتبہ تحسین فراقی، جعفر بلوچ)، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۱

۲۳- اختر راہی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۷۸، اردو تراجم کے بارے میں معلومات کے لیے راقم الحروف کا زیادہ تر انحصار ''ترجمہ ہای متون فارسی بہ زبان ہای پاکستانی'' پر رہا ہے۔

۲۴- رشید احمد صدیقی، ''سہیل کی سرگزشت''، صفحات ۲۱۶ - ۲۱۷ [بدقسمتی سے کتاب کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے، اِس کے ابتدائی صفحات موجود نہیں، اِس لیے کتاب کے مکمل کوائف نقل نہیں کیے جا سکتے]۔

۲۵- اختر راہی، حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۳ - ۲۶

۲۶- گارساں دتاسی پانچویں خطبے میں بنی نرائن جہاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''یہ [تنبیہ الغافلین] ایک مذہبی کتاب ہے جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور جدیدوہابی فرقے کے بانی سیّد احمد (شہید) کی فرمائش پر تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور بھی ترجمے ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [بنی نرائن] جہاں فرقہ وہابی سے تعلق رکھتا تھا، یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ اس آخرالذکر کتاب کے دیباچے میں اس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان' (''خطبات گارساں دتاسی''، حصہ اول، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۹ء، صفحات ۱۰۲-۱۰۳)

سیّد محمد بی-اے (عثمانیہ) نے گارساں دتاسی پر انحصار کرتے ہوئے لکھ دیا ہے: ''اس بیان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، بنی نرائن جہاں کا ترجمہ تنبیہ الغافلین موجود ہے جس سے یہ بیان بالکل مصدقہ ہو جاتا ہے' (''ارباب نثرِ اردو''، حوالہ مذکورہ، ص ۲۳۷)، تاہم گارساں دتاسی کی قیاس آرائی اور سیّد محمد بی-اے کی نقل کے برعکس سیّد محمد حنیف نقوی اور بعض دوسرے اہلِ علم بنی نرائن جہاں کے مسلمان ہونے کی تائید نہیں کرتے، بلکہ تردید کرتے ہیں۔ دیکھیے: سمیع اللہ،''انیسویں صدی میں اُردو کے تصنیفی ادارے''، حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۶۶-۱۷۱

۲۷- سیّد محمد بی-اے (عثمانیہ) نے ''تنبیہ الغافلین'' کے ترجمے کے حوالے سے لکھا ہے:

> آج کل تنبیہ الغافلین کے جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں، وہ یقیناً بنی نرائن کے نہیں ہیں۔ بنی نرائن کے ترجمہ میں صرف ۲۰ ابواب ہیں اور موجودہ نسخوں میں ۲۵ ابواب پائے جاتے ہیں۔ مطبوعہ ترجمہ سیّد محمود، محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی متحدہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز اور مولوی امیرالدین کی تصحیح سے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی بنی نرائن کے ترجمہ کرنے کا ذکر نہیں، البتہ یہ فقرہ موجود ہے 'اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو جس میں ۲۰ باب تھے، فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا، لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ بنی نرائن ہی کا ہے، آیتوں اور

حدیثوں سے [کذا، میں] غلطیاں رہ جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، نیز اس ترجمہ کو ہندی میں بتانا بھی یہ امر ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد انہی کا ترجمہ ہے، کیوں کہ فورٹ ولیم کالج کے اہلِ قلم اور اس زمانہ کے اکثر مصنفوں کی کتابوں میں اردو کو جگہ جگہ ہندی کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور کہیں بھی اردو کا لفظ نہیں لکھا گیا، علاوہ ازیں بنی نرائن ہی کا ترجمہ **۲۰** ابواب پر مشتمل ہے (حوالہ مذکورہ، ص ۲۴۴)۔